یکم مارچ ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۹

اس شمارے میں

اداریہ

الیکشن اور اردو

خوشی کی بات ہے کہ اب کے لوک سبھا کے الیکشن کے موقع پر اردو کا چرچا بھی ہوا ہے، تمام سیکولر پارٹیوں نے اردو کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہے اور اس کی تعلیم کے لئے سہولتیں دینے کا وعدہ کیا ہے جن سنگھ نے بھی اپنے کو سیکولر ثابت کرنے کے لئے اردو کے لئے سہولتیں دینے کی بات کی ہے گو اسی سانس میں یہ بھی کہا ہے کہ وہ اترپردیش، بہار اور دہلی میں اسے سرکاری زبان تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے تمام پارٹیوں نے اپنے پوسٹر اور اعلانات اردو میں بھی شائع کئے ہیں، اردو کے کچھ نئے اخبار بھی اس زمانے میں نکلے ہیں۔ خدا کرے یہ اخبار جاری رہیں اور چند دن کے بعد دم نہ توڑ دیں، یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ کچھ حلقوں میں ووٹروں کی فہرستیں اردو میں بھی تیار ہوئی ہیں، چیف الیکشن کمشنر نے اعلان کیا ہے کہ اترپردیش کے چوبیس حلقوں میں ہندی کے علاوہ اردو میں بھی ووٹ کے پرچے ہوں گے۔ دہلی میں ہندی کے علاوہ اردو اور انگریزی میں بھی ہوں گے۔ کشمیر میں بھی ووٹ کے پرچے اردو میں ہوں گے۔ یہ سب باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ تمام سیاسی پارٹیوں کو اس بات کا احساس ہو چلا ہے کہ جب تک اردو کے ساتھ انصاف نہ ہوگا۔ اردو دوستوں کی بے اطمینانی اور شکایت دور نہ ہوگی، مگر الیکشن کے موقع پر کچھ وعدے کر لینا، یا ووٹ کے سلسلے میں کچھ سہولتیں فراہم کرنا کافی نہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سلسلے میں عملی اقدامات ہوں، اب تک تو یہ دیکھا گیا ہے کہ ہمدردی کے باوجود برسر اقتدار پارٹی اردو کی بقا اور تحفظ کے لئے وہ قدم نہیں اٹھا پائی جس کی صراحت دستور کی دفعہ ۳۴۷ میں موجود ہے، پھر مخالف پارٹیوں نے برسر اقتدار پارٹی کو اس سلسلے میں مطعون کیا اور اس کی کوتاہی کو یاد دلا کر اپنے لئے فضا تو ہموار کی، مگر جب ان میں سے بعض کو مخلوط وزارتوں میں کچھ کرنے کا موقع ملا تو ان کے دعوے بھی باطل ثابت ہوئے اس لئے ہم یہ بات صاف صاف کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جب تک اردو کی تعلیم اور چلن کے لئے تمام سہولتیں جو ملنی چاہئیں، فراہم نہ ہوں گی، اس وقت تک اردو دوست مطمئن نہ ہوں گے، اردو دوستوں کو اب صرف وعدوں پر نہیں بہلایا جا سکتا، ضرورت صاف اور واضح احکام کی ہے جن کی پوری گنجائش دستور کے دفعات ۳۴۷ اور ۳۵۰ میں ہے، اس لئے یا تو صدر جمہوریہ کے حکم سے ان تمام ریاستوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ آبادی ہے، اردو کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے، یا ان ریاستوں کی قانون ساز مجلسیں اپنے سرکاری زبان کے قانون میں ترمیم کر کے، اردو کو سرکاری طور پر تسلیم کرنے کے لئے گنجائش نکالیں، سرکاری زبان کا مطالبہ نام و نمود کے لئے یا کسی علیحدگی پسندی کے جذبے کے تحت نہیں ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ جب تک سرکاری طور پر کسی زبان کی تعلیم اور چلن کا تحفظ نہیں ہوتا، افسر اور کارکن من مانی کرتے ہیں یا تنگ نظری یا تعصب کی بنا پر اردو کے حقوق کو نظر انداز کرتے ہیں بلکہ ہر تمام سیکولر پارٹیوں کو اردو کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے اس کا احساس ہے، اب

جو پارٹی برسرِ اقتدار آئے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے وعدے پورے کرے اور اردو کے تحفظ کے لئے عملی قدم اٹھائے اور اس کی تعلیم اور چلن کے سلسلے میں رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے سرکاری مشنری کو حرکت میں لائے۔ ارباب نظر کے خیال میں ہوا کا رُخ تو اس وقت نئی کانگریس کی طرف ہے، اس سے خاص طور سے یہ کہنا ہے کہ اتر پردیش، بہار، آندھرا، میسور، دلّی میں اردو کو سرکاری زبان تسلیم کیا جائے اور مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، راجستھان، ہریانہ، پنجاب میں اس کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لئے مناسب سہولتیں دی جائیں۔ مخالف پارٹیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس معاملے کو صرف پارٹی کے نقطۂ نظر سے نہ دیکھیں، بلکہ ایک قومی مسئلہ سمجھ کر اس سلسلے میں برسرِ اقتدار پارٹی سے تعاون کریں۔ اگر اردو دوستوں کے مطالبات تسلیم کر لئے گئے اور اگر نتیجے کے طور پر بعض ریاستوں میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ مل گیا تو اردو دوستوں کو پورے جوش اور ولولے سے سماج کی تعمیر اور ملک کی ترقی میں حصہ لینے کا موقع ملے گا، اردو دوست خود بھی اپنے پورے قد کو پہنچیں گے اور ملک کے قد کو بھی بلند کریں گے۔ اردو دوستوں کو جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم پر ایمان رکھنے والی پارٹیوں کی حمایت کرنی چاہیے۔ ان کو ترقی ہوگی تو اردو کے ساتھ انصاف کے جذبے کو بھی ترقی ہوگی، اردو کے ساتھ انصاف ہوگا تو جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کی حمایت کا جذبہ اردو دوستوں میں اور گہرا اور توانا ہوگا، اس لئے ملک کی پوری تاریخ کو اپنانے والی مشترک تہذیب پر فخر کرنے والی، آگے کی طرف دیکھنے والی، ہندوستان کی کثرت میں وحدت پر اصرار کرنے والی اور اس کثرت کے ذریعہ سے وحدت کی رعنائی اور زیبائی پر فخر کرنے والی جماعتوں کی حمایت، دراصل اردو کی حمایت ہوگی۔ انجمن کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں، یہ ایک ادبی اور تہذیبی ادارہ ہے، مگر وہ ادب اور تہذیب جس کی حفاظت انجمن کا نصب العین ہے، جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کے ہندوستان میں فروغ اور استحکام کے بغیر محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اسی لئے اردو دوستوں کو ان تمام طاقتوں کا ساتھ دینا چاہیے جو اس منزل کی طرف گامزن ہیں۔

اردو زندہ باد ——— ہندوستان پائندہ باد

اردو میں ڈی۔ لٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ۲۰ر فروری کے کانووکیشن میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی لیکچرر دہلی کالج دہلی کو، اُن کی مرتب کردہ کتاب "دیوانِ ذوق" پر جو دو جلدوں میں ہے، یونیورسٹی نے ڈی۔ لٹ کی ڈگری دی ہے، یونیورسٹی کی آرٹس کی فیکلٹی میں یہ پہلی ڈگری ہے علوی صاحب نے چند سال پہلے علی گڑھ سے "ذوق" سوانح اور انتقاد کے عنوان پر پی۔ ایچ۔ ڈی کیا تھا دونوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

• نامہ نگار

نور جہاں پر لکھی ہوئی نظموں کی ضرورت

میں نذر نور جہاں کے نام سے ملکۂ ہند "نور جہاں" سے متعلق لکھی گئی نظموں کو مرتب کر رہا ہوں۔ شعراء حضرات سے گزارش ہے کہ اپنی نظمیں اور مختصر سوانح ۳۰ر مئی ۱۹۷۱ء تک درج ذیل پتہ پر ارسال فرما کر ممنون فرمائیں۔

نجم الحسن انجم ادیب
انجم منزل۔ گنگاوار پالیہ کولار (ریاست میسور)

"حرف و صدا"

عبدالمتین نیاز کا دوسرا شعری مجموعہ "حرف و صدا" فکر و آگہی کا ایک اور خوبصورت نقش عنقریب طبع ہو رہا ہے ناشر مرکز ادب بھوپال ہے۔

• نامہ نگار

"زخموں کے گلاب" کی اشاعت

صلاح الدین نیّر کا دوسرا شعری مجموعہ "زخموں کے گلاب" کے نام سے عنقریب شائع ہو رہا ہے اس مجموعہ میں غزلوں کے علاوہ رومانی اور موضوعاتی نظمیں بھی شامل رہیں گی۔

• نیّر گیتالو کے نام سے ساہتیہ کلا پریشد کھمم (آندھرا پردیش) کے زیرِ اہتمام صلاح الدین نیّر کی غزلوں کا منظوم تلگو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

• نامہ نگار

نثار احمد فاروقی

اردو میں دانش وری کی روایت

(ماضی اور حال)

ہمیں سب سے پہلے یہ غور کرنا ہوگا کہ "دانش وری" سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ صرف INTELLECTUALISM کا ترجمہ ہے؟ اس بزم کے برپا کرنے والوں نے غالباً اس کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ ہم اپنے مسائل سے باخبر ہوں، ان پر سوچتے ہوں، اور ان کا حل تلاش کرنے کے درپے رہتے ہوں تو "دانش ور" کہلائیں گے۔ یا ہمارے ذہن شاداب ہوں، ان میں نئے افکار اُگتے ہوں، مستقبل کے خاکے بنانے کی صلاحیت رکھتے ہوں، ماضی سے باخبر ہوں یا عبرت حاصل کرتے ہوں، حال پر قانع اور فردا سے مایوس نہ ہوں وغیرہ اس کے سوا اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ویسے یہاں "دانشوری" کی مختصر تعریف کرنا دشوار ہوگا۔ جتنا مبہم موضوع ہے اتنی ہی اس پر گفتگو بھی مبہم یا پیچیدہ ہو تو آپ کو آزردہ نہ ہونا چاہئے۔

سوچنا یہ ہے کہ کیا اردو میں کبھی دانشوری کی روایت رہی ہے؟ دعوت نامے میں لکھا گیا ہے کہ "سب رس سے سیدین تک سارا اردو ادب ہماری جاگیر ہے اس میں دانشوری کی روایت تلاش کر کے اس پر گفتگو کی جائے۔" مجھے یہاں اختصار سے یہی کہنا ہے کہ اردو شاعری میں امیر خسرو سے قلی قطب شاہ تک اور ولی دکنی سے وزیر آغا تک، ادھر نثر میں فضل علی فضلی سے میر امن تک اور ان سے سیدین بلکہ عابد رضا بیدار تک۔ مجھے دانشوری کی کوئی روایت نظر نہیں آتی۔ ہمارا ادب بہت سے پہلو رکھتا ہی نہیں۔ اس میں غزل ہے، قصیدہ ہے، مرثیہ ہے واسوخت اور شہر آشوب ہے، یا مطلع و مقطع ہے۔ نثر میں داستانیں ہیں، قصے ہیں، ناول اور افسانے ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ سرسید اور ان کے رفقا کی نثر کو بھول جائیے تو ESSAY کا نمونہ بھی نہیں ہے۔ جنس ہمیشہ ہمارے اعصاب پر سوار رہی ہے اس لئے ہم شاعری میں بھی عشقیہ جذبات کی ترجمانی سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ شعر کا غلبہ اس قدر ہے کہ ہمارے یہاں بھیک مانگنے والا گا کر مانگتا ہے، بازاری دوا فروش شعر سنا کر تیل بیچتا ہے، نثر میں بھی جب تک شاعرانہ استعاروں کی چاشنی اور مبالغہ یا کنایہ نہ ہو وہ ہمارے حلق سے نیچے نہیں اترتی۔ منطقی استدلال گویا ایک خشک گفتگو، بھلا ان سب باتوں سے کیا واسطہ؟ "گرسب رس سے سیدین تک یہی سب کچھ ہے!

ادب اردو سے اگر ہم غالب، سرسید، اقبال اور حالی کو بے دخل کر دیں تو ایسا کون لکھنے والا ہے جسے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہو کہ زمانے میں محبت کے سوا بھی کوئی غم ہے؟ تیسری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ موضوع میں "اردو" ہی کی کیا تخصیص ہے؟ یا تو یہ کہئے کہ "ہندوستان میں دانشوری کی روایت" اس لئے کہ دانشوری کسی زبان میں محصور نہیں ہوتی۔ زبان تو صرف اظہار کا وسیلہ ہے اگر دانشوری مفقود ہے تو ہندوستان ہی میں نہیں ہے ورنہ اردو میں پہلے ہی کمیاب ہوتی ہندی، مرہٹی یا گجراتی میں اس کا وجود ملتا۔ اگر یہ مقصد ہے کہ بقیہ زبانوں میں ہے اردو میں نہیں ہے تو کتنی زبانوں کی روایات کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا ہے؟ اگر یہ کہئے کہ ہمیں اردو سے غرض ہے دوسری زبانوں سے سروکار نہیں تو یہ علیحدگی پسندی کی تعلیم INDIANIZATION کے دور میں کیوں دی جا رہی ہے؟ دراصل اس میں بھی ایک چور چھپا ہوا ہے بلکہ قصداً چھپایا گیا ہے۔ موضوع گفتگو یہ ہونا چاہئے تھا کہ "مسلمانوں میں دانشوری کی روایت" لیکن اسے سیکولر بنانے کے لئے "اردو ادب" کی آڑ لی گئی ہے حالانکہ مسلمان اور اردو، ایک ہی حقیقت کے مظاہر ہیں اور ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ لہٰذا میں جو کچھ بھی کہوں گا وہ یہ سمجھ کر کہوں گا کہ مسلمان اپنی دانشوری کو کھو چکا ہے، اس کی ذہانت، حمیت اور ولولہ گم ہوگیا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے افکار کا وسیلۂ اظہار

آفتاب شمسی

غزل

تیزاب پھینکتا ہوا مجھ پر نکل گیا
اک لمحہ میرے ذہن کو بالکل بدل گیا

آئینہ کے تن سے ڈھونڈ رہی ہے لباس روح
کھونٹی پہ ٹنگے ٹنگے یہ ملبوس گل گیا

مقتول مرتے وقت نہ کچھ منہ سے کہہ سکا
اپنا لہو مگر مرے چہرے پہ مل گیا

جل کر کچھ اور لے لیا اس نے گرفت میں
ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ رسّی کا بل گیا

کھڑکی سے چھن کے آئی تھی مدت کے بعد آج
بڑھ کر اندھیرا روشنی ساری نگل گیا

لہریں دھوئیں کی گھومتی پھرتی ہیں شہر میں
تنہائی کے الاؤ میں ہر شخص جل گیا

اردو زبان رہی ہے۔ اس زبان کا ادب پڑھئے تو آپ کو اردو کے تقریباً دو سو برس کے نثری اور شعری سرمائے میں پوری مسلم معاشرت اپنی جزئی تفصیلات کے ساتھ جھلکتی ہوئی ملے گی۔ ہندی مسلمانوں کے سوچنے کا انداز، اُن کے عقائد، تصورات و توہمات، کارنامے اور کرتوت سبھی اردو ادب میں آگئے ہیں۔ لہٰذا موضوع گفتگو یہ ہونا چاہئے کہ اردو زبان جو تقریباً دو سو برس سے مسلمانوں کے افکار کی آئینہ دار ہے اس میں مسلم قوم کی ذہانت اور سوجھ بوجھ کا سرمایہ کتنا ہے اور اب اس زبان میں فکر انگیز موضوعات پر کیوں نہیں لکھا جارہا ہے؟

پہلے ایک دو باتیں خارج از بحث عرض کردوں۔ مسلمانوں کی علمی اور ثقافتی تاریخ بہت طویل اور پیچیدہ مگر مربوط ہے۔ پچھلے تیرہ سو برس میں یہ قوم بڑے بڑے انقلابوں سے گذری ہے۔ ابتداء میں مسلمانوں کا ثقافتی مرکز مکّہ تھا، ہجرت کے ساتھ یہ مدینہ کو منتقل ہوا۔ حضرت علیؓ کے دور میں کوفہ ہوا۔ امویوں کے عہد میں دمشق اور عباسیوں کی حکومت میں بغداد۔ تاتاریوں کے حملے نے یہ مرکز غزنین اور بخارا کو منتقل کیا، پھر تقریباً ساڑھے چھ سو برس تک دلی کو مرکزیت حاصل رہی۔ زوال سلطنت کے ساتھ مختلف ریاستیں جیسے لکھنؤ، حیدرآباد وغیرہ رہے۔ پھر مرکز کا تصور ہی ختم ہوگیا۔ جیسے اردو زبان کی ٹکسال دلّی اور لکھنؤ تھے مگر اب ہر شہر ٹکسال ہے۔ ثقافتی مرکز کے ختم ہونے سے مسلم فکر میں انتشار پیدا ہوگیا ہے جیسے پتّے درخت سے ٹوٹ گئے ہوں۔ اب یہ غور کرنا چاہیئے کہ مسلم ذہانت کے اظہار کا وسیلہ تین زبانیں رہی ہیں سب سے پہلے عربی۔ پھر فارسی۔ اور آخر میں اردو۔ ہندوستان میں ایک طویل عرصے تک یہ رہا کہ ہم نے عام زبان اور علمی زبان کو الگ الگ رکھا یعنی بول چال اور روزمرہ کا دربار کی زبان اردو تھی مگر تصنیف و تالیف کے لئے فارسی۔ اور مذہبی امور کے لئے عربی۔ اردو کو تصنیف کی زبان بننے کا موقع ۱۸۰۰ء کے بعد ملا ہے۔ اس وقت ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی گرفت مضبوط ہوچکی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی برائے نام حکومت بھی ختم ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی مغربی تہذیب اور مغربی افکار کا نفوذ شروع ہوا۔

آہستہ آہستہ انگریزی تمام ملک میں پڑھے لکھے طبقے کی زبان بن گئی۔ مغل دور میں علم و فضل کا منتہیٰ یہ تھا کہ آدمی "جامع معقول و منقول" ہو یعنی معقولات میں منطق، فلسفہ، ہیئت، نجوم، ہندسہ اور طب۔ منقولات میں حدیث، تفسیر، فقہ۔ اس کے سوا کسی چیز کا جاننا ضروری نہیں تھا۔ انگریزی تعلیم کے ساتھ سائنس کے علوم نے نصاب میں جگہ پائی، معاشیات، عمرانیات، نفسیات اور سیاسیات کو وہ اہمیت دی گئی جو ہم حدیث و فقہ کو دیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی طرز تعلیم پر جو شخص فارغ ہوکر نکلا وہ انگریزی زبان و ادب سے واقف اور علوم طبیعیات سے بلد ہوتا تھا

لہٰذا علم و فضل کا معیار پچھلی صدیوں کے مقابلے میں بالکل بدل گیا۔ پہلے ہم نورالدین جامی کو ملا جامی کہا کرتے تھے اب ملا کسے کہتے ہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں، یہی حال منشی، حکیم، قاضی اور مفتی کا ہوا ہے۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں میں سرسید کے دور تک ایک شاعر بھی ایسا نہیں تھا جس نے روایتی تعلیم کے سوا علوم جدیدہ سے بہرہ مند ہونے کی سعادت حاصل کی ہو۔ سرسید تحریک کے اثر سے اتنا ہوا کہ جو لوگ دوسروں کے عقائد اور افکار سے بھڑکتے تھے اور انہیں قابل اعتنا ہی نہیں سمجھتے تھے انہوں نے دوسرے تصورات سے بھی کچھ کچھ سمجھوتا کرلیا۔ سرسید بھی ایک مشکل میں گرفتار تھے وہ قدیم تصورات سے یک لخت بغاوت نہیں کرسکتے تھے ورنہ ان کی کوئی بھی نہ سنتا اور جدید خیالات کو شرک کے غلاف میں لپیٹ کر دینا چاہتے تھے۔ قرآن کی تفسیر آکسفورڈ انداز سے لکھنے کی کوشش کا ماحصل یہی ہے کہ وہ قدیم و جدید میں تطبیق اور ہم آہنگی پیدا کردیں۔

جب علم و فضل کا معیار اور اعلیٰ تصنیف کی زبان انگریزی بن گئی تو اس زبان میں ہندوستان کے ہر طبقے والے شریک و سہیم ہوگئے۔ اب انگریزی میں جو کچھ لکھا جائے گا وہ ظاہر ہے کہ صرف مسلمانوں کے مسائل تک محدود نہیں ہوگا اس کے مخاطب سارے ہی انگریزی خواں ہوں گے لہٰذا معاملات و مسائل بھی بدل گئے، ان کا کینوس زیادہ وسیع ہوگیا، مختلف فرقوں، مذہبوں اور علاقوں کے لوگ ایک ہی ذریعۂ اظہار سے اپنے مشترک مسائل پر گفتگو کرنے لگے اردو زبان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا کہ وہ غزل اور افسانے کی زبان بن کر رہ جائے۔ چنانچہ جب ہم حظ نفس یا استراحت کے لئے کچھ پڑھنا چاہتے ہیں تو میر و غالب یا اختر شیرانی اور مجاز کو پڑھتے ہیں، منٹو، بیدی اور شفیق الرحمٰن سے لطف اٹھاتے ہیں مگر سیاست، معاشرت یا اقتصادیات کے پیچیدہ مسائل پر کچھ جاننا چاہتے ہیں تو انگریزی زبان کی طرف دیکھتے ہیں۔

اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ انگریزی میں آپ ایک مضمون کسی بہت نازک مسئلے پر لکھیے۔ مثلاً گاندھی جی کے فلسفے کی مذمت کیجئے یا ہندوستان میں مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کو سراہیئے یا ہندوؤں کو تقسیم ملک کا ذمہ دار گردانیے تو آپ کو کچھ دشواری پیش نہیں آئے گی۔ لوگ آپ سے متفق ہوں یا نہ ہوں آپ کا مضمون ضرور پڑھ لیں گے مگر اسی موضوع پر وہی MATTER آپ اردو میں لکھ دیجئے تو ایک طوفان بدتمیزی اٹھ کھڑا ہوگا اور لکھنے والے کو جنت یا حوالات بھی نصیب ہوسکتی ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ دراصل اردو پڑھنے والا طبقہ وہی رہ گیا ہے جو غزل پڑھ پڑھ کر سر دھنتا ہے وہ ذہین اور باشعور طبقہ جو عہد حاضر کے معیار علم و فضل پر پورا اتر سکتا ہے انگریزی کے وسیلے سے ملتا ہے اس کا ذہن اتنا محدود اور متعصّب نہیں ہے جتنا اردو پڑھنے والوں کا ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ میں یہ عجیب لطیفہ رہا ہے کہ تجدید پسند اور قدامت پرست دونوں گروہ ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں عباسی دور میں آپ کو معتزلہ اور اہل حدیث ملیں گے دور متوسط میں صوفی اور فقیہہ، عہد حاضر میں مغرب زدہ اور قدامت دوست یعنی مسلمان آج بھی ایک ذہنی سطح کا نہیں ہے، جاہل اور عالم کی تفریق تو خیر سب جگہ ہوتی ہے یہاں عالم اور عالم میں بھی امتیاز ہے۔ ایک محض پڑھا لکھا ہے دوسرا پڑھا لکھا جاہل ہے اور ظاہر ہے کہ یہ زیادہ خطرناک ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ قدامت پرستوں کو ہمیشہ غلبہ حاصل رہا ہے، انھوں نے مذہب کو اپنی پناہ گاہ بنا لیا ہے۔ جیسے بعض مجرم کسی عبادت خانے میں پناہ لے لیتے ہیں اور پولیس قانون کے مطابق انھیں وہاں سے گرفتار نہیں کر سکتی، اسی طرح یہ طبقہ جو ہر عہد میں مسلمانوں کے زوال اور پستی کا سبب رہا ہے اور آج سب سے زیادہ ہے، مذہب کو اپنا پشتی بان بنائے ہوئے ہے۔ جن عقائد اور تصورات کا پروپگنڈا اردو میں آئے دن ہوتا رہتا ہے اور خاموشی سے زہریلی غذا ذہنوں کو مہیا کر کے اس قدامت پرست طبقے کے مفید مطلب بناتا رہتا ہے ان افکار سے انگریزی ابھی تک محفوظ و مامون رہی ہے اس لئے انگریزی میں آپ اونچی آواز میں سوچیں تو آپ کا قاری بھڑکے گا نہیں۔ بلکہ زیادہ امکان پسندیدگی کا ہے۔ مگر اردو میں آپ ایسی جرأت بھول کر نہ کیجئے گا۔

خلاصۂ کلام کے طور پر یہی کہنا چاہتا ہوں کہ اردو میں پہلے تو دانشوری کی روایت پیدا کیجئے جسے آنے والی نسلیں فروغ دیں گی اور اس روایت کے پیدا کرنے کی اولین شرط یہ ہے کہ آزادی اظہار پر ایمان پیدا کیجئے۔ ہمارے ذہنوں میں ابھی تک فرسودہ اخلاقی تصورات بسے ہوئے ہیں، تقدس کا جامہ قریب قریب ہر شخص کو مرحوم ہوتے ہی پہنا دیا جاتا ہے اب اگر آپ نے حضرت فلاں ابن فلاں رحمۃ اللہ علیہ کے فرمودات سے اختلاف کیا تو کفر کے فتووں کی مشین تو آج کل زنگ زدہ پڑی ہوئی ہے آپ کو دریدہ دہن، گستاخ، اور ہذیانی وغیرہ کے خطابات البتہ مل سکتے ہیں۔ شیخ سعدی نے کہا تھا کہ مال تجارت سے بڑھتا ہے اور علم بحث سے بتایئے بحث بغیر اختلاف کے کس طرح ہو سکتی ہے؟ دوسری کمزوری پیری مریدی ہے یہ تصوف میں تو ٹھیک ہے مگر ہمارے ہاں علم میں، سیاست میں اور ادب میں بھی سلسلہ بیعت چلتا ہے اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ اندھی تقلید ہوگا۔ مُرید قسم کا آدمی دانشور ہو ہی نہیں سکتا۔

یورپ نے بھی علم اور سائنس کے میدان میں ترقی اسی وقت شروع کی ہے جب پاپائیت کا جُوا اپنے کندھے سے اتار پھینکا۔ اردو زبان میں جو طبقہ ہمارا مخاطب ہے وہ ابھی تک آزاد خیال نہیں ہے۔ خیال کی آزادی کتنی بڑی نعمت ہے یہ بات اگر اسے معلوم ہو جائے تو ساری دنیا کی دولت دے کر بھی اسے خریدنا چاہے گا۔ مگر جو لوگ اسے منبر سے خطاب کرتے ہیں انھوں نے یہ بتا رکھا ہے کہ اللہ کا قانون ازل سے ابد تک کے لئے یوں کر لوح محفوظ میں ثبت ہو چکا ہے، اب ایک ذرّہ بھی اس کی مرضی اور علم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا، مسلمان کے لئے یہ دنیا قید خانہ ہے، اس زندگی کے مسائل کو چھوڑ کر اسے ہر وقت توبہ استغفار کر کے انفرادی نجات کا طلبگار رہنا چاہئے۔ مسلمانوں پر جو بلائیں آ رہی ہیں یہ سب اس کی بد اعمالیوں کا ثمرہ ہیں اگر سارے مسلمان اوراد و وظائف میں مشغول ہو جائیں تو دنیا بھر کی طاغوتی طاقتیں مل کر بھی مسلمانوں کا بال بیکا نہیں کر سکتیں، عام آدمی ان سب باتوں کو بار بار سن کر اتنے راسخ العقیدہ ہو چکے ہیں کہ وہ خود چاہے اعمال صالح کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں مگر یہ عقیدہ ضرور رکھتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان جن حالات سے گزر رہا ہے یا اسرائیل کے ہاتھوں عربوں کو جو نقصان پہنچ رہا ہے یہ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ نہ پہننے کا یا بد اعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ اس منطق سے روس، امریکہ اور چین والے تو بڑے ہی انتہائی گنہگار قسم کے لوگ ثابت ہو جاتے ہیں!

آپ سوچیں گے کہ یہ سب باتیں بے جوڑ سی ہیں۔ میرا مدعا یہ ہے کہ ہمارے مخاطبین کو دانشوری کی باتیں سننے کی عادت ہی نہیں ہے تو ہمیں کہنے کی مشق کہاں سے ہو؟ اور ہم کہیں بھی تو سنائیں کس کو۔ بقول شخصے جیسا تمہارا دیا لینا ویسا ہی ہمارا گانا بجانا سمجھئے۔ اسلامی شریعت کے ماخذ پانچ تھے قرآن، حدیث، قیاس، اجماع اور اجتہاد۔ یہ پانچواں اجتہاد کا دروازہ ہمارے علمائے مذہب نے پہلے ہی بند کر دیا ہے اس میں اور باتوں کے علاوہ یہی مصلحت رہی ہوگی کہ اجتہاد کو جاری کر دیں تو کس کو حق اجتہاد ہے کس کو نہیں ہے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جائے گا۔ پھر مذہب کا صحیح علم اور اس کی اسپرٹ سے واقفیت رکھنے والے لوگ بھی آ جائیں گے جو ہماری بالادستی کو ختم کر دیں گے۔ اب نتیجہ یہ ہے کہ علمائے مغرب راکٹ بنا کر چاند پر جاتے ہیں تو یہ طبقہ پریشان ہو جاتا ہے کہ جو مسئلے رویت ہلال سے طے ہوتے تھے وہ چاند پر آبادی ہو جانے کے بعد کیسے حل ہوں گے یا [illegible] DATE - LINE کو کراس کرنے والا پچھلی پانچ نمازیں جو وہ پڑھ کر جا رہا ہے دوبارہ پڑھے گا یا نہ پڑھے گا۔ یہ تو پھر بھی معقول سے سوال معلوم ہوتے ہیں ان علماء نے پچھلی صدی میں سیکڑوں صفحے اس موضوع پر سیاہ کئے ہیں کہ کوّا حلال ہے یا حرام ہے۔ جو ذہن ایسے لوگوں کے سایۂ عاطفت میں پلے بڑھے ہوں انھیں عقلیت پسند دانشوروں کی باتیں کیسے ہضم ہو جائیں گی؟

دوسری صدی ہجری میں جب یونانی فلسفے اور منطق کی کتابیں ترجمہ ہو کر عربی میں آ رہی تھیں اور عیسائی اور یہودی علماء اسلام کو نیچا دکھانے کے لئے طرح طرح کے منطقی مغالطے پیدا کر رہے تھے اور

معقولی دلیلوں سے اسلام کے عقائد اور تصورات کو باطل ثابت کرنا چاہتے تھے اس وقت خود مسلمانوں میں ایک ایسا ذہین طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس نے ارسطو اور افلاطون کے فلسفے کی دھجیاں بکھیر دی تھیں اور انھیں طفل مکتب ثابت کر دیا تھا یہاں تک کہ خود یورپ کو نو افلاطونی فلسفے کی نئی تہذیب کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ ان متکلمین کے طبقے کو اور ان کی تصانیف کو اگر ہم نے شقاوت اور بیدردی کے ساتھ کچلا اور ضائع نہ کیا گیا ہوتا تو آج مسلمان ہی علمی اور سائنسی ترقی کے اس مقام پر نظر آتا جہاں ہم یورپ اور امریکہ کو دیکھ رہے ہیں۔ مگر مذہب کے ان نادان دوستوں نے ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے کہ نئے افکار سے جو بہرہ اندوز ہو جاتا ہے وہ مذہب سے بیگانہ بلکہ بعض حالات میں اس کا دشمن بن جاتا ہے اور جو بالکل بھیڑ بن کر ان کی تقلید کرتا رہتا ہے وہ دین اور دنیا دونوں ہی سے کھو یا جاتا ہے۔

لہٰذا یہ کہنا تو کسی طرح درست نہیں کہ آج اردو کے لکھنے والے مسائل سے باخبر نہیں یا ان کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ یا ان پر کچھ لکھنا نہیں چاہتے۔ دراصل آج کے مسائل بھی دو طرح کے ہیں یعنی بنیادی اور فروعی۔ بنیادی مسئلے تو ساری بنی نوع انسان کے مشترک مسئلے ہیں اور فروعی مسئلوں میں ایسے لوگوں کو الجھا دیا گیا ہے جو اگر فرصت سے بیٹھے رہیں تو نہ سوچیں گے نہ سونے دیں گے۔ مسلمانوں کو ہندوستان میں جو مسائل درپیش ہیں یہ بھی فروعی ہیں۔ اور اس طبقے کے پیدا کئے ہوئے ہیں جو اصلی مسئلوں سے توجہ ہٹانا چاہتا ہے۔ مذہب بھی ہمارا فروعی مسئلہ ہے اسے تزکیہ اخلاق کے لئے، خیر و شر کی تمیز کرنے کے لئے اور سوسائٹی میں ایک مفید زندگی گزارنے کے لئے رہنما بنایا جا سکتا ہے لیکن اس کی غلط ترجمانی اور اندھی تقلید نے اسے ہماری اجتماعی زندگی کے راستے کا روڑا بنا دیا ہے۔

کوئی روایت ایک دن میں نہیں بنتی اس کے پیچھے صدیوں کا ریاض ہوتا ہے۔ ہندی مسلمانوں کو اب کچھ نئے افکار کی تخم ریزی کرنا لازمی ہے اس لئے کہ آنے والی تاریخ میں ان کا حصہ اور حیثیت ماضی سے قطعاً مختلف ہوگی۔ انھیں سائنس کی اہمیت کو سمجھنا ہے، انھیں دوسرے مذاہب سے واقفیت اور ان کا تقابلی مطالعہ کرنا ہے انھیں ہندو تہذیب اور ہندو فلسفے کو ہمدردی کی نگاہ سے پڑھنا ہے۔ اب بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھنے کا زمانہ نہیں رہا۔ مگر وہ مذہبی طبقہ جو مسلمانوں کے ذہن اور مزاج پر قاہرانہ قبضہ کئے ہوئے ہے صدیوں کی مشقت سے ان ذہنوں کو سخت بنجر، پتھر یلا اور بر خود غلط بنا چکا ہے مسلمانوں کی تہذیب اور خیالات میں بنیادی طور پر جارحیت شامل رہی ہے یہ جہاں بھی گئے ہیں، وہاں کی وطنی تہذیب کی نمود ختم کر دی ہے، مصر، ترکی، افغانستان، ایران وغیرہ اس کی مثالیں ہیں لیکن ہندوستان میں ان کی تہذیب کو توسیع تو ملی مگر نمود کا موقع نہیں ملا اور یہاں کی مقامی تہذیب ان سے ختم نہیں ہو سکی مسلمانوں کی اپنی تہذیب اور تصورات کا جائزہ اب منطقی اور سائنسی انداز سے لینا ہوگا اور ہندوستان میں جہاں ان کی تہذیبی جارحیت ناکام رہی وہاں منطقی استدلال اور رواداری بڑا اہم رول ادا کر سکتی ہیں۔ یہی ہندوستانی مسلمانوں کو یہاں آبرومندی سے جینے کا گُر بھی سکھائے گی۔

آزادیٔ فکر اور آزادیٔ اظہار کے بغیر دانشوری پنپ نہیں سکتی، اس آزادی کو ہم بغاوت سے حاصل کر سکتے ہیں وہ بغاوت اسی مسلم پاپائیت کے خلاف ہونی چاہئے جو ہمارے ذہنوں کو دیمک کی طرح لگی ہوئی ہے۔

(دہلی کے سیمینار منعقدہ ۲۳، ۲۴ جنوری ۱۹۷۱ء میں پڑھا گیا۔)

فارم ۱۷

دیکھو رول ۸

اخبار ہماری زبان

علی گڈھ

۱۔ مقام اشاعت	سلطان جہاں منزل علی گڑھ
۲۔ نوعیت اشاعت	ہفتہ وار
۳۔ نام پرنٹر	ہیش چندر گپتا
قومیت	ہندوستانی
پتہ	لیتھو کلر پرنٹرس اچل تال علی گڑھ
۴۔ نام پبلشر	سید تفضل حسین ایم اے
قومیت	ہندوستانی
پتہ	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
۵۔ نام ایڈیٹر	آل احمد سرور
قومیت	ہندوستانی
پتہ	شبلی روڈ علی گڑھ
۶۔ نام و پتہ مالک اخبار	انجمن ترقی اردو ہند سلطان جہاں منزل علی گڑھ

میں سید تفضل حسین تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

یکم مارچ ۱۹۷۱ء — سید تفضل حسین ایم۔ اے

مراسلات

دکنی کی ابتداء

۸ ؍ فروری کے "ہماری زبان" میں جاوید وششٹ صاحب کا مراسلہ پڑھا۔ بظاہر ان کا یہ عتاب بجا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اردو اور دکنی کے دو الگ الگ زبانیں ہونے کے مسئلے میں ڈاکٹر سہیل بخاری کی اولیت کے بارے میں تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہے۔ میرا جواب پڑھ لینے کے بعد جاوید صاحب کو اطمینان ہو جائے گا کہ میں نے کسی کا حق غصب نہیں کیا ہے۔

ڈاکٹر سہیل کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے :-

وجہی کا یہ خیال کہ وہ "زبان ہندوستان" میں سب رس لکھ رہے ہیں درست نہیں، کیوں کہ "ہندوستان" سے مراد صرف شہر دہلی یا شاہجہاں آباد ہے۔ اس لئے زبان ہندوستان سے مراد شہر دہلی یا شاہجہاں آباد کی زبان ہوئی لیکن جس زمانے (۱۶۳۵) میں وجہی نے سب رس لکھی اس زمانے میں شہر دہلی میں اردو کا رواج ہی نہ تھا بلکہ اس زمانے میں دہلی میں جس زبان کا رواج تھا وہ ہریانی تھی اور جب وجہی کو دعویٰ ہے کہ وہ زبانِ ہندوستان میں لکھ رہے ہیں تو لا محالہ سب رس کی زبان ہندوستانی یعنی دہلی کی ہریانی ہوئی۔ اس ہریانی کو اردو سمجھ بیٹھنا ہماری اپنی غلطی ہے"۔

اردو کا چرچا سب سے پہلے آگرے ہی میں سننے کو ملتا ہے شہر دہلی اردو سے بالکل خالی تھا، سنہ ۱۶۴۸ء میں شاہجہاں آگرے سے اپنی راجدھانی اٹھا کر دہلی لے گیا تو دلی میں اردوئے معلیٰ کا علاقہ بسا اور وہاں اردو کا رواج ہوا۔ اور دکن میں دہلی کی ہریانی زبان کا رواج اس طرح ہوا کہ "ہندوستان" میں مسلمانوں کے آنے کے بعد زبان نے پنجاب سے براہ دہلی دکن کی جانب سفر کیا" تو پورے مغربی علاقے میں شمال سے لے کر جنوب تک جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں ان میں حیرت انگیز مشابہت ملتی ہے اس لئے کہ ان سب کا تعلق ایک ہی خانوادے یعنی شورسینی سے ہے۔

میرا اپنا نظریہ یہ ہے :-

شاہ گلشن نے ولی کو زبان دکنی چھوڑ کر اردوئے معلیٰ کے موافق ریختہ کہنے کا مشورہ دیا تھا اور قائم اور انشا نے دکنی کو "لچر" اور "نامانوس غیر متعارف" اور میر نے دکن کے شاعروں کو مسخرے اور بالکل بے رتبہ کہا تھا تو دوسرے الفاظ میں یہی کہا تھا کہ دکنی اور اردو دو الگ زبانیں ہیں یعنی مجھ سے اور ڈاکٹر سہیل بخاری سے پہلے مذکورہ چار بزرگ بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ زبان دکنی، زبان اردو ہے۔ میں نے بھی انھیں بزرگوں کے اقوال جا بجا دلائل کے طور پر پیش کئے ہیں، اس لئے یہ کوئی اچھوتا نظریہ نہیں ہے۔ "مظہر جانجاناں، حاتم، قائم کے یہاں دکن کی "لچر" زبان کے خلاف سخت قسم کا رد عمل ملتا ہے" صفحہ ۲۲۲ مقدمہ تاریخ زبان اردو اب "دکنی کی ابتدا" اور ڈاکٹر سہیل کی "سب رس پر ایک نظر" میں یہ فرق ہیں کہ :-

(۱) میں اس نظریہ کی قائل ہوں کہ دہلی کی اردو یا ہریانی سے دکنی ماخوذ نہیں ہے اور ڈاکٹر سہیل دکنی کو دلی کی اردو نہیں بلکہ ہریانی مانتے ہیں۔

(۲) میں ڈاکٹر سہیل کی طرح اس کی بھی قائل نہیں کہ مسلمانوں کے پنجاب سے براہ دہلی دکن کی جانب سفر کرنے کے نتیجے میں (۱۱۹۲ء میں فتح دہلی سے ۱۳۲۷ء میں دولت آباد کو پایۂ تخت قرار دینے تک کے عرصے میں) دہلی کی ہریانی دکن میں پہنچی بلکہ مسلمانوں کے دلی پہنچنے سے کم از کم ساڑھے پانچ سو سال پہلے سے دکن میں دکنی کی داغ بیل پڑنی شروع ہو گئی تھی۔

(۳) آگرے سے شاہجہاں کے ساتھ جو اردوئے معلیٰ دلی آئی اس پر برج بھاشا اور راجستھانی بولیوں کا گہرا اثر تھا اور یہ بھی ہریانی کی طرح شورسینی ہی کی بولیاں تھیں۔

ڈاکٹر سہیل کی کتاب کا خلاصہ انھیں کے الفاظ میں :-

وجہی کہتے ہیں کہ انھوں نے سب رس زبان ہندوستان میں لکھی ہے :

"آغاز داستان زبان ہندوستان، نقل ایک شہر تھا، اس شہر کا ناؤں سیستان" صفحہ ۹

"ہندوستان سے مراد صرف شہر دہلی یا شاہجہاں آباد ہے" صفحہ ۵۱

"۱۶۳۵ء تک جب کہ وجہی نے سب رس لکھی ہے شہر دہلی میں اردو کا رواج ہی نہ تھا، دہلی میں اردو کا داخلہ پہلی بار ۱۶۴۸ء میں اردوئے معلیٰ کا علاقہ بسنے کے بعد ہوتا ہے کیونکہ اسی سنہ میں شاہجہاں آگرے سے اپنی راجدھانی اٹھا کر دلی لے گیا تھا، اس سے پہلے اس کے چرچے آگرے ہی میں سننے کو ملتے ہیں، شہر دہلی اس زبان سے بالکل خالی تھا، ایسی صورت میں وجہی کی زبان ہندوستان سے زبان اردوئے معلیٰ مراد لینا درست نہیں" صفحہ ۵۲

"اردو اور دکنی میں جتنا اختلاف ہے ہریانی اور دکنی میں اتنی ہی مشابہت موجود ہے۔ وجہی کی زبان ہندوستان کو ہریانی کی بجائے اردو سمجھ بیٹھنا ہماری

اپنی غلطی ہے صفحہ ۹"

"سب رس کی دکنی ہندوستانی یعنے دہلی کی ہریانی سے بہت کچھ مشابہ ہے، یہ ایک ایسی بدیہی بات ہے جس کو تمام ماہرین لسانیات نے محسوس کیا ہے کہ دہلی سے بجانب راست اگر دکن کی طرف سفر کیا جائے تو پورے مغربی علاقے میں شمال سے لے کر جنوب تک ہریانی، پنجابی، راجستھانی، گجراتی، سندھی، کوکنی اور مغربی مرہٹی وغیرہ جتنی زبانیں بولی جاری ہیں ان میں حیرت انگیز مشابہت ملتی ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا تعلق زبانوں کے ایک ہی خاندان یعنی شورسینی سے ہے اور یہ تعلق کوئی آج کا نہیں بلکہ ازمنۂ قدیم سے یوں ہی چلا آرہا ہے، اس لئے اردو کے بعض مورخین کا یہ فقرہ کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے کے بعد زبان نے پنجاب سے براہ دہلی دکن کی جانب سفر کیا ایک قدیم لسانی حقیقت کی جدید تاویل سے زیادہ نہیں صفحہ ۸۳":

ڈاکٹر سہیل کے مذکورہ بالا اقوال سے واضح ہے کہ دکنی کی ابتدا کے بارے میں انھیں اپنے پیشروؤں کے بنیادی نظریوں سے کوئی اختلاف نہیں، ان کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ دکنی دلی کی زبان ہے اور اس کو دکن میں دلی سے آنے والے مسلمان لائے لیکن ایک ضمنی اختلاف صرف اتنا ہے کہ دکنی دلی کی اردو نہیں بلکہ ہریانی ہے" اس لئے اردو اور ہریانی میں جو فرق ہے وہی فرق دکنی اور اردو میں ہے لیکن ہیں دونوں دلی کی زبانیں۔ ڈاکٹر سہیل دکنی کو دکن کے ماحول کی پیداوار نہیں بلکہ بدیسی زبان مانتے ہیں۔

مدت ہوئی جناب عزیز احمد صاحب نے جن کے نام ڈاکٹر سہیل نے اپنی کتاب معنون کی ہے، ازراہ کرم مجھے یہ کتاب بھیجی تھی اور خود ڈاکٹر سہیل کو "دکنی کی ابتدا" سے کوئی رنجش یا شکایت نہیں ہے، چنانچہ لکھا ہے :-

"میں نے کتاب کا اول سے آخر تک مطالعہ کیا، ماشاءاللہ آپ نے بہت محنت سے کام کیا ہے آپ کی اس سعی مشکور پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اس تحفے کے بھیجنے پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں آپ کی تحقیق کو دیکھ کر امید ہے کہ دکنی کی صوتیات، صرف اور نحو پر بھی کام ہونے لگے گا، بہرحال اس میدان میں کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوگی اور اس کا کچھ نہ کچھ مفید نتیجہ بھی برآمد ہوگا، انشاءاللہ والسلام نیاز مند سہیل بخاری (مکتوب مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۷۰ء)"

• آمنہ خاتون

حافظ شیرازی امیر خسرو کے کلام کے ناقل؟

امیر خسرو دہلوی کے خمسے کی شروع کی ۳ مثنویاں شاعر کی آنکھ بند ہونے کے ۳۰ سال بعد نقل کی گئی ہیں۔ اور خاتمے پر جو عبارت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی نے انھیں اپنے قلم سے نقل کیا تھا۔ یہ قلمی نسخہ تاشقند کے مخطوطا کتب خانے میں ہے۔

ایک ایرانی عالم جعفر افتخار (مقیم تاشقند) کا بیان ہے کہ بہرحال یہ حافظ شیرازی ہیں۔ جس زمانے میں یہ کلام نقل ہوا وہ حافظ کی نوجوانی کا زمانہ ہے۔ اگر یہ حافظ ہی ہیں تو قابل فخر بات ہے کہ ایک ہندوستانی شاعر کا فارسی کلام فارسی زبان کے سب سے مقبول اور لافانی شاعر نے مشق کے طور پر نقل کیا۔ ایران کے محقق ڈاکٹر محمد معین نے اس پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ اس پائے کا ایرانی شاعر بھلا کیوں ہندوستان کے فارسی شاعر کا کلام نقل کرتا۔

سوال:- حافظ کی دستخطی تحریر یا کوئی ایسا نسخہ کسی کے پاس نہیں جس سے قطعی طور پر فیصلہ کیا جا سکے کہ یہ انہی حافظ شیراز کا قلم ہے یا کسی اور کا۔

کیا دنیا کے کسی حصے میں حافظ شیرازی کے ہاتھ کی کوئی حتمی تحریر ایسی ہے جس سے موازنہ اور مقابلہ کر کے صحیح نتیجہ نکالا جا سکے؟ کیا اور کوئی ایسے شواہد موجود ہیں جن کی روشنی سے اس قضیے کا فیصلہ ہو سکے۔

ماسکو۔ • ظ انصاری

امیر خسرو کے کلیات کا سب سے قدیم نسخہ؟

امیر خسرو دہلوی کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ ۸۸۵ھ کا (۸۸-۱۴۸۰ء) لینن گراڈ یونیورسٹی کی مشرقی فیکلٹی کے مخطوطات میں موجود ہے یعنی شاعر کے انتقال کے ۱۶۰ سال بعد جمع کیا گیا۔ کاتب کا نام ہے سلطان احمد، اس نے ہرات میں یہ نسخہ مرتب کیا تھا۔ اس میں ۲۰ ہزار سے زائد اشعار محفوظ ہیں اور کئی مثنویاں شامل نہیں ہیں" کلیات کے اب تک جتنے نسخوں کا حوالہ دیا گیا ہے، ان میں سب سے قدیم یہی معلوم ہوتا ہے۔

مولانا سلیمان اشرف نے "ہشت بہشت" کے دیباچے میں (۱۹۱۸ء) جتنے قلمی نسخوں کا حوالہ دیا ہے، ان میں کوئی بھی اس سے پہلے کا نہیں ہے۔

سوال:- کیا ہندوستان کے قلمی نسخوں میں اس سے زیادہ معتبر اور قدیم نسخہ امیر خسرو کے کلیات کا کہیں موجود ہے جس کو اختلافی الفاظ میں سند کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔

ماسکو۔ • ظ انصاری

انجمن کی خبریں

اردو جونیر کالجوں کے قیام میں تلگو داں طلبہ کا حصہ

بھونگیر (آندھرا پردیش) جناب سرینواس لاہوٹی معتمد انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے ایک خصوصی اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے مقدمہ کو مستحکم اور مضبوط بنانا ہو تو اس مرتبہ ہونے والی مردم شماری میں صحیح طریقہ پر نہ صرف اردو پڑھے لکھے بلکہ اردو میں بات چیت کرنے والے حضرات بھی اپنی مادری زبان اردو لکھوائیں اور اس غرض کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی جائے۔

جناب لاہوٹی نے کہا کہ دوسری زبانوں سے نفرت نہ کی جائے ورنہ سماجی، سیاسی، معاشی حیثیت سے نقصان ہوگا۔ بالخصوص تلگو زبان پر دسترس حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اس طرح اردو والوں اور دوسری زبان والوں میں ربط قائم رہے گا۔

جناب لاہوٹی نے اردو جونیر کالجوں کے سلسلے میں کہا کہ جب تک طلبہ کی تعداد حسب منشا حکومت نہ ہو اس کا قیام مشکل ہے اس وقت آندھرا پردیش میں (۳۹) جونیر کالج قائم ہیں جس کے منجملہ علاقہ تلنگانہ میں (۳۳) ہیں۔ اگر بھونگیر میں بھی طلبہ کی مقررہ تعداد مل جائے تو جونیر کالج قائم ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اتفاق سے دو مواقع حاصل ہو رہے ہیں ایک تو مردم شماری جس میں آپ سب کا فرض ہے کہ خانہ نمبر ۱۲ میں مادری زبان اردو لکھوائیں اور دوسری زبان کے خانہ میں مقامی زبان تلگو اسی طرح تلگو داں حضرات سے دوسری زبان کے خانہ میں اردو لکھوانے کی کوشش کی جائے۔ دوسرا موقع الکشن کا ہے ایسے امیدوار کو ووٹ دیں جو اردو کے مقدمہ کی پرزور وکالت کر سکے۔ • نامہ نگار

مردم شماری اور اردو کے مسائل پر غور

اننت پور (آندھرا)۔ انجمن ترقی اردو اننت پور کا خصوصی اجلاس جناب ٹی ایچ پیراں نظامی صدر انجمن کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ اجلاس میں بعض قراردادیں بھی منظور کی گئیں۔ ایک قرارداد میں انجمن نے مردم شماری کے نگران افسر سے اپنے کارکنوں کو یہ ہدایت دینے کی اپیل کی ہے کہ کوئی شخص لاعلمی سے اپنی زبان ہندوستانی یا کچھ اور بتائے تو وہ مادری زبان کے خانہ میں اردو کا اندراج کروائیں ایک اور قرارداد میں حسب خرچ سے مقامی گورنمنٹ جونیر کالج میں جون ۸۱ء سے قبل اردو کی متوازی جماعتوں کے قیام کی درخواست کی گئی ہے، ایک اور قرارداد میں تلگو ذریعہ کے مدارس میں اردو ٹرینڈ مدرس کے تقرر کی اپیل کی گئی ہے۔ • نامہ نگار

کندوکور ضلع ونگول میں انجمن کی شاخ کا قیام

یہاں انجمن ترقی اردو کی شاخ کا قیام عمل میں آیا۔ کندوکور کے اردو دوست احباب کا ایک جلسہ جناب فضل الرحیم طرار ایم۔ اے (عثمانیہ) لیکچرار اردو کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں جناب موصوف نے اردو و انجمن کے قیام کی اہمیت اور افادیت کا احساس دلایا۔ تمام حاضرین نے انجمن کے لئے قواعد کو منظوری دی اور کارکنوں کا چناؤ عمل میں آیا۔

جناب ڈاکٹر سلطان محی الدین صاحب صدر، جناب تاج الدین بابا ایم۔ اے لیکچرار ریاضیات، نائب صدر، جناب فضل الرحیم طرار ایم۔ اے۔ اعزازی سکریٹری، جناب سید رحمت اللہ میر صاحب، نائب معتمد چنے گئے اور ان کے علاوہ سات اراکین انتظامیہ کا انتخاب ہوا۔ • فضل الرحیم طرار

انجمن ترقی اردو کو مدیر رہنمائے دکن کا عطیہ

حیدرآباد۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کو مردم شماری کے اخراجات کے سلسلہ میں جناب سید وقار الدین ایڈیٹر رہنمائے دکن نے (۲۰۰) روپیہ کا عطیہ دیا ہے۔ • نامہ نگار

لسانی و تہذیبی یگانگت کے لئے تمام زبانوں سے انصاف ضروری

حیدرآباد۔ ریاستی وزیر مارکٹنگ جناب رامچندر راؤ کلیانی نے کہا کہ ملک کی ہمہ گیر ترقی اور لسانی و تہذیبی یگانگت و فروغ کے لئے تمام زبانوں سے انصاف ضروری ہے۔ جناب کلیانی نارائن پیٹھ (آندھرا) میں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام منعقدہ یوم اردو سے خطاب کر رہے تھے۔

جناب کلیانی نے کہا کہ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے اس زبان سے ناانصافی کی شکایت بھی سننے میں آتی ہے، انھوں نے یقین دلایا کہ اردو کے تعلق سے ریاستی حکومت ہمیشہ فراخدلانہ سلوک کرتی رہے گی۔ جناب کلیانی نے اردو والوں کو مشورہ دیا کہ وہ دوسری زبانیں بھی سیکھیں اور کسی بھی زبان کو کسی بھی خاص مذہب سے وابستہ کر کے نہ دیکھیں۔

جناب سری نواس لاہوٹی معتمد انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ریاستی حکومت کا رویہ اردو سے حقیقت پسندانہ ہونے کے باوجود وزارت تعلیم سے اردو والوں کو بعض انتہائی واجبی شکایتیں ہیں انھوں نے عادل آباد میں اردو اور مرہٹی طلبہ کی طرف سے تعلیمی سہولت کے لئے احتجاجی مہم کی بھرپور تائید کرتے ہوئے ریاستی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ فوری مداخلت کرے۔ • نامہ نگار

اخبار و اذکار

اردو کے لئے رقم کی منظوری

لکھنؤ: ریاستی حکومت نے پرائمری اسکولوں میں اردو پڑھانے کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے ۵۹۰۰ روپیہ کی رقم منظور کی ہے۔ اس رقم میں سے مالیاتی سال رواں کے دوران دو کل باڈیز کو پرائمری اسکولوں میں اردو پڑھانے کے لئے ۲۲۹ ٹیچروں کی تقرری کرنے کے واسطے امداد دی جائے گی۔ • قومی آواز

سعادت صدیقی کی تصنیف "حبسیہ غالب" کی رسم اجراء

لکھنؤ۔ ادارہ فروغ اردو ہند کا ایک غیر معمولی جلسہ ڈاکٹر سید رغیب حسین ریڈر لکھنؤ یونیورسٹی کی صدارت میں اتوار کو منعقد ہوا جس میں جناب سعادت علی صدیقی مدیر ماہنامہ فروغ اردو، لکھنؤ کی تصنیف "حبسیہ غالب" کی رسم اجراء عمل میں آئی یہ کتاب غالب کے حادثۂ اسیری سے متعلق ہے۔

ڈاکٹر سید رغیب حسین صدر جلسہ نے کتاب کا اجراء فرماتے ہوئے سعادت صدیقی کا تعارف کرایا اور ان کی کتاب "حبسیہ غالب" کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ غالب کے حادثۂ اسیری پر یہ کتاب غالبیات کے باب میں قابل قدر اضافہ ہے اس میں غالب کے حادثۂ اسیری سے متعلق سارا مواد سلیقہ سے یکجا کر دیا گیا ہے نیز غالب کا جیل میں کہا گیا فارسی ترکیب بند اور اس کا اردو ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ • سکریٹری نشر و اشاعت

ایوانِ اردو میں جلسۂ تعزیت عنایت جنگ مرحوم

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے ایوانِ اردو میں نواب عنایت جنگ کے سانحۂ ارتحال پر ایک جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔ پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ نے صدارت کی، جناب ایل این گپتا نے نواب صاحب کی علمی، ادبی اور تہذیبی خدمات اور کارناموں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ان کا انتقال ادارہ کے لئے اندوہناک ہے۔

جناب حامد علی عباسی، جناب میر سراج الدین علی خاں، جناب ممتاز حسین خاں، جناب وقار خلیل اور جناب راحت عزمی صاحب اور جناب سید علی اکبر صاحب نے مرحوم کی اردو سے متعلق خدمات کو سراہا اور آپ کے انتقال کو ادارہ کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان بتایا۔ • وقار خلیل

اردو دارالمطالعہ کا افتتاح

کندہ کور میں اردو دارالمطالعہ کا افتتاح مسٹر ی۔ ڈی کے کرشنا سوامی پرنسپل گورنمنٹ کالج کندہ کور کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت جناب میجر رفیع الدین احمد صاحب ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی۔ (علیگ)، صدر شعبہ حاشیات نے کی۔ جناب ڈاکٹر صاحب نے معزز مہمانوں کا تعارف کروایا۔ جناب پرنسپل صاحب نے اردو دارالمطالعہ کے قیام کو ایک "فال نیک" قرار دیا اور طلبہ و اردو دوست احباب سے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ • فضل الرحیم آزاد

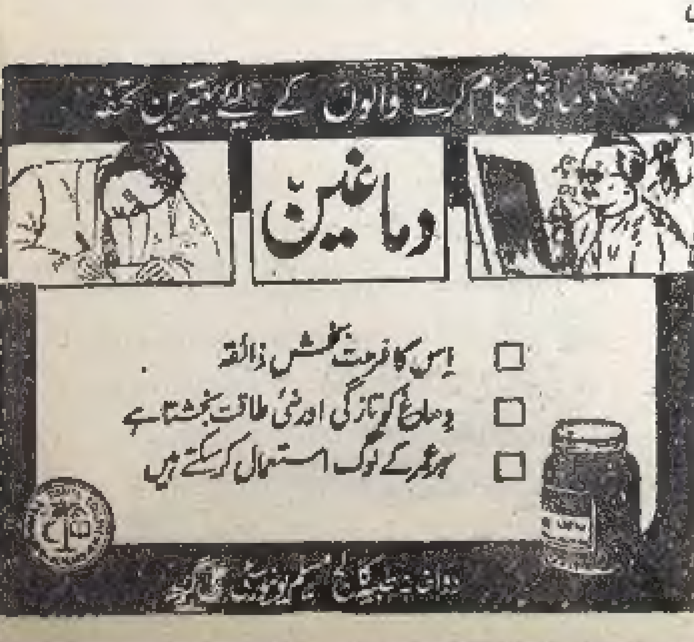
ادبی سنگم بمبئی

• ادبی سنگم کی ماہانہ نشست جناب عادل رشید کی صدارت میں محبوبی بلڈنگ، پشپا پارک میں منعقد ہوئی۔ جلسہ کے آغاز میں جناب قیصر عثمانی نے حضرت روش صدیقی اور جناب عابد علی عابد کے انتقال کے متعلق "ہماری زبان" میں چھپی ہوئی دو دو سطر خبریں پڑھ کر سنائیں۔ اس کے بعد ایک منٹ کی مکمل خاموشی اختیار کر کے انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس اظہار غم کے بعد سال رواں میں مشہور ساحر لدھیانوی اور غلام ربانی تاباں کے "پدم شری" سے نوازے جانے پر "ادبی سنگم" نے حکومت ہند کی ادب دوستی کو بھی سراہا۔ اس کے بعد شعری نشست ہوئی جس میں ممتاز شعراء نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ • نامہ نگار

تعزیتی قرارداد

بھوپال: کاروان سفینہ کے ایک ہنگامی اجلاس میں روش صدیقی، عابد علی اور احترام الدین شاغل کی وفات پر ایک تعزیتی قرارداد منظور کی گئی جس میں مرحومین کی خدمات کو سراہا گیا اور ان کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔

• سکریٹری "کاروان سفینہ"



ایوانِ اردو میں خیر مقدمی محفلِ شعر

حیدرآباد۔ "ایوانِ اردو" میں دو ادبی جرائد سب رس، اور سہ ماہی "شعر و حکمت" کی طرف سے ممتاز شاعر اور صحافی جناب اعجاز صدیقی کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ پروفیسر سید محمد نے صدارت کی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے اعجاز صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کی صحافتی اور شعری خدمات کا ذکر کیا۔ جناب رشید الدین نے "اعجاز صدیقی چند تاثرات" کے زیرِ عنوان مضمون سنایا۔ ایڈیٹر "شاعر" نے عصرانے کے بعد ایوانِ اردو کے میوزیم اور کتب خانہ کا معائنہ کیا اور خیر مقدمی تقریب کے انعقاد پر تقریر کرتے ہوئے، حیدرآباد کے ہر دو ادبی جرائد اور حیدرآباد کے ادبی رجحانات کی صحت مند اور فعال سرگرمیوں پر اظہارِ مسرت کیا اور ڈاکٹر زور کی یاد تازہ کرتے ہوئے ایوانِ اردو کو ہندوستان کے چند خوبصورت اور کارکرد اداروں میں سے ایک قرار دیا۔

● وقار خلیل

میسور کا مشاعرہ

"بزمِ اردو" میسور کا دوسرا سالانہ مشاعرہ بڑے پیمانے پر انجمن اتحادِ اسلام میسور میں زیرِ صدارت جناب محمد ہاشم علی صاحب ایم۔ اے، ایل، ایل، بی منایا گیا جس میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریمان اننت رنگاچار معتمد گاندھی پیس فاؤنڈیشن سنٹر، میسور شریک تھے۔

صدرِ مشاعرہ نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ "گذشتہ ۲۲ سال میں جب اردو کچلی گئی ہے تو اس زبان کا نام کروڑوں انسانوں تک صرف فلموں اور مشاعروں کے ذریعہ پہنچا ہے اس نے اردو کو سامعین کا ایک نیا گروہ دیا ہے جو اردو تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے زبان کو کم سمجھتا ہے لیکن اس کے حسن اور لطافت کا گرویدہ ہے، یہ گروہ مشاعروں میں بہت بڑی تعداد میں نظر آتا ہے اور حسبِ توفیق شعر سے لطف لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس گروہ کے خلاف حقارت کا انداز ایک ایسے احساسِ برتری کا نتیجہ ہے جس سے اردو زبان و ادب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔"

مشاعرہ کے خصوصی مہمان شریمان اننت رنگاچار نے اپنی دلچسپ تقریر میں جو عام بول چال کی اردو میں تھی، اس زبان کی لطافت و شیرینی پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے فروغ اور ترقی پر زور دیا اور اپنے طور سے اس کے لئے بھرپور تعاون کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ بھارت میں ہر زبان کا ایک الگ علاقہ بنایا گیا، لیکن آج تک اردو کا کوئی علاقہ نہیں بن سکا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اردو زبان کسی خاص علاقہ کی محتاج بھی نہیں ہے۔ وہ ہر جگہ بولی اور لکھی جاتی ہے۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ دوسری زبانوں کی طرح اسے کسی خاص علاقہ میں مقید نہیں کیا گیا چونکہ اس ہندوستان گیر زبان کی قید بندی نہیں کی جا سکتی اس سے یہ ثابت ہوا کہ سارا بھارت ہی اس کا علاقہ ہے!!

اس کے بعد محفلِ مشاعرہ کا آغاز ہوا جس میں ممتاز و نامور شعرائے کرام نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔

● عمران سعید

صفحہ ۱۲ سے آگے

قطعاً متفق ہوں کہ "جب ہند و پاک جنگ ہوئی تو پاکستان کی فتح مندی کے لئے خواب میں بھی خیال نہیں آسکتا، ہندوستان کی فتح مندی کے لئے بھی دل سے دعا نہ نکلی۔ جی چاہا تو بس یہی کہ جلد سے جلد دونوں اپنی سرحدوں میں لوٹ جائیں اور امن ہو جائے۔" "امن" کی خواہش یقیناً بہت مبارک تھی اور ہندوستان کی "فتح مندی" اس اعتبار سے کہ اس کا قبضہ پاکستان پر ہو جائے کوئی بھی نہیں چاہتا تھا، یہاں تک کہ حکومتِ ہند کا بھی یہ مقصد نہیں تھا۔ البتہ ہندوستان کی یہ فتح مندی ہر ہندوستانی کے دل کی صدا ہونی چاہیے تھی کہ پاکستان نے جن مقاصد کے پیشِ نظر یہ جنگ شروع کی تھی ان میں اسے ہرگز کامیابی نہ حاصل ہو اور ہندوستان کا نام اونچا رہے۔ ان جزوی اختلافات کے باوجود میرے نزدیک کتاب لائقِ مطالعہ ہے البتہ اس کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے قیمت بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے اس کا مطالعہ کم لوگ ہی کر سکیں گے۔

تبصرہ

ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شروانی

سیما کی تلاش

مصنف: ڈاکٹر عابد رضا بیدار
ناشر: مسلم پروگریسو گروپ، نئی دہلی
ضخامت: ۵۰ صفحات
قیمت: پانچ روپے

کتاب کا اصل موضوع "ہندوستانی مسلمانوں کے بھارتیہ کرن کا مسئلہ" ہے اور یہی اس کا ذیلی عنوان ہے مسلمانوں کے بھارتیہ کرن کا نعرہ جن سنگھ نے بلند کیا ہے اور جیسا کہ سب جانتے ہیں اس میں اس کی نیت بخیر نہیں ہے بھارتیہ کرن کا اصلی مقصد اگر ہندوستانیوں کو صحیح معنی میں ہندوستانی بنانا ہو تو میرے نزدیک کسی کو اس سے اختلاف نہیں ہونا چاہیے لیکن اس صورت میں ہندو، مسلمان یا اکثریت، اقلیت کی تمیز ناروا ہے کیوں کہ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ابھی تک صحیح قومی شعور بہت کم لوگوں میں پیدا ہو سکا ہے اور اس طرح کی جو کوشش بھی کی جائے وہ یقیناً مستحسن اور محمود ہے لیکن اس کا دائرہ پورے طور پر وسیع ہونا چاہیے اور اس میں مذہبی یا علاقائی تعصبات کو بالکل داخل نہیں کرنا چاہیے ورنہ اصلی مقصد فوت ہو جائے گا اور بجائے نفع کے نقصان پہنچے گا جیسا کہ جن سنگھ کے موجودہ نعرے سے پہنچ رہا ہے۔

عابد رضا صاحب نے اپنی زیرِ تبصرہ تصنیف میں اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے کی کوشش کی ہے اور پڑھنے والوں کے لئے غور و فکر کا کافی مواد مہیا کیا ہے۔ ان کا طرزِ فکر بنیادی طور پر درست معلوم ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو ایسے معاملات میں جن کا تعلق دوسروں کی خدمات سے ہو رواداری سے کام لینا چاہیے اور یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ دوسروں کا طرزِ عمل کیا ہے اگر ایسا اب تک نہیں ہوا ہے تو اب ہونا چاہیے، اس لئے نہیں کہ حالات کا دباؤ ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہے بلکہ اس لئے کہ یہ کام کرنے کا ہے اور ہمیں اس کی پروا بھی نہیں کرنی چاہیے کہ کوئی ہم پر سرکار پرستی یا خود غرضی کا الزام لگائے گا۔ عابد رضا صاحب کے اس بنیادی طرزِ فکر سے متفق ہونے کے باوجود جزئیات میں بعض جگہ مجھے ان سے اختلاف ہے۔ مثلاً ان کی رائے ہے کہ ہندوؤں کے مقدس مقامات پر مسلمانوں کی جو عبادت گاہیں زبانِ حال سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ دراصل وہ مندر تھے جنھیں مسلمان سلاطین نے مسجدوں میں تبدیل کر دیا تھا انھیں مسلمانوں کو برضا و رغبت ہندوؤں کے حوالے کر دینا چاہیے۔ میری رائے میں یہ مسئلے کا صحیح حل نہیں ہے۔ اس سے بات رُکے گی نہیں بلکہ اور آگے بڑھے گی۔ اگر مسلمان ایک مسجد ہندوؤں کے حوالے کر دیں گے تو پھر دوسری مسجد کا مطالبہ ہوگا اور پھر تیسری کا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ جن مسلمان سلاطین نے ایسا کیا وہ قابلِ مذمت ہیں لیکن ماضی میں جو کچھ ہو گیا اس کی ذمہ داری موجودہ نسل پر عائد کرنا اور اس کا پراشچت ان سے طلب کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔ اس بارے میں میں پنڈت سندر لال کی اس رائے سے پوری طرح متفق ہوں کہ ہندوستان کا جو دور شروع ہوا ہے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جس صورت میں ملا ہے اسے اسی صورت میں قائم رہنا چاہیے ہماری ذمہ داری اس وقت سے شروع ہوتی ہے، اس سے پہلے جو کچھ ہوا اس کے لئے ہم کسی درجے میں بھی ذمہ دار نہیں ہیں۔

اسی طرح پان اسلام ازم کے موضوع پر عابد رضا صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے (اور جو دراصل کتاب کا دوسرا حصہ ہے) اس میں بھی مجھے ان سے کئی جگہ اختلاف ہے جہاں تک "جذبۂ اخوتِ اسلامی" کا تعلق ہے یقیناً وہ ایک فطری جذبہ ہے اور اس پر روک لگانا ممکن ہے اور نہ مستحسن لیکن جب اس مسئلے سے بحث کی جاتی ہے تو فی الحقیقت اس کا سیاسی پہلو ہی پیشِ نظر ہوتا ہے اور سیاسی اعتبار سے کسی ملک کے باشندے کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے ملک کے مقابلے میں کسی دوسرے ملک کو ترجیح دے یا اسے اپنے ملک کے درجے پر رکھے خواہ اس سے اس کا کیسا ہی جذباتی یا روحانی رشتہ کیوں نہ ہو۔ پاکستان کا مسئلہ اور بھی الجھا ہوا ہے اور یہ الجھاؤ اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ قیامِ پاکستان کی مساعی میں ہندوستانی مسلمان نہ صرف شریکِ مساوی بلکہ بڑی حد تک شریکِ غالب تھے۔ اس حقیقت سے صرفِ نظر کسی طرح ممکن نہیں ہے بے شک ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات بہتر ہونے چاہئیں اور بے شک انھیں بھائیوں کی طرح مل کر رہنا چاہیے لیکن اس معاملے میں ہندوستانی مسلمانوں کو بہت محتاط رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور یہ احتیاط خود ان کے گذشتہ طرزِ عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔

میں عابد رضا صاحب کے اس جذبے کی قدر کرنے سے

(باقی ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا
REGD. NO. L. 922 فون نمبر ۲۹ R. NO. 2186/57